(غلام گردش)

دھند، وادی میں اُمڈ آئی تھی!

نتھیا گلی پہنچتے ہوئے شام ہو چکی تھی۔ دن کے ڈھلنے کا وقت۔ لگ رہا تھا کہ سورج تھک ہار کر اب جانے کی اجازت چاہ رہا ہے۔ ویسے تو سورج ہمیشہ قائم ہی رہتا ہے۔ کبھی دنیا کے ایک حصے پر اور کبھی دوسرے پر۔ گاڑی اسد چلا رہا تھا اور کم از کم مجھ سے تو بہت بہتر طریقے سے چلا رہا تھا۔ دو برس بعد اس جگہ واپس آیا تھا۔

اہم چیز جو دیکھنے میں آئی۔ وہ تھی ہر طرف درختوں کی صحت مند قطاریں۔ اس علاقہ میں بہت زیادہ درخت ہیں۔ کم از کم دو سال پہلے سے زیادہ۔ لگتا ہے کسی کو آخر کار قدرت کے عظیم تحفے یعنی درخت اُگانے اور انکی حفاظت کا خیال آ ہی گیا ہے۔ نتھیا گلی کے اردگرد جہاں تک انسانی نظر جا سکتی ہے، ہرے بھرے خوبصورت درخت ایستادہ نظر آتے ہیں۔ انسان کی حفاظت کیلئے قدرت کی سب سے طاقتور فصیل۔ چلتی ہوئی گاڑی سے ایسے نظر آ رہا تھا کہ یہ ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ جب گاڑی تیز ہوتی تھی تو سبزے کی دوڑ کی رفتار بھی بڑھ جاتی تھی۔ نتھیا گلی آنے سے پہلے ایک اور نظارہ بھی بے حد عام ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بے تحاشہ بندر جنگل سے نکل کر آرام سے باہر بیٹھ جاتے ہیں۔ لوگوں کیلئے یہ بے حد نایاب بات ہے۔ گاڑیوں والے رُکتے ہیں۔ بندروں کو کھانے کی کوئی چیز دیتے ہیں۔ بندر کسی تکلف کے بغیر سڑک کے کنارے پر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وہ موقعہ ہے جس وقت لوگ فون سے انکی تصویریں لینی شروع کر دیتے ہیں۔ جب بندر سیر ہو کر کھا لیتا ہے تو واپس جنگل میں چلا جاتا ہے۔ اسکی جگہ کوئی اور بندر قریب ہی سے آ جاتا ہے۔ معاملہ جہاں سے ختم ہوا تھا، وہیں سے دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ سینکڑوں بندر اپنی بھوک مٹانے کیلئے ٹیڑھی میڑھی جگہوں پر بیٹھے نظر آئے۔ انکے ساتھ اسی طرح بے تحاشہ لوگ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور تو اپنی بھوک مٹا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ انسانی بھوک ہے جو کبھی ختم ہی نہیں ہو پاتی۔ وسائل بڑھانے کی ایک ایسی خوفناک دوڑ لگی ہوئی ہے جس سے معاشرے میں شدید عدم توازن پیدا ہو چکا ہے۔ ہر آدمی امیر نہیں، بہت زیادہ امیر ہونا چاہتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ متعدد دفعہ دولت اپنے ساتھ مسائل کا ایک انبار ساتھ لاتی ہے۔ دولت مند باپ کی موت اکثر اوقات ناخلف اولاد کیلئے بہترین خوشخبری ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے اپنے تمام ارمان بغیر محنت کے آئی ہوئی دولت سے پوری کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ہمارے جیسے منافق معاشرے میں مسائل جیت چکے ہیں۔ خیر بندر ایک دوسرے سے لڑے بغیر کھانا کھا رہے تھے۔ کم از کم شروع شروع میں یہ سب کچھ کافی اچھا لگتا ہے۔ ایک تین ٹانگوں والا چھوٹا سا بندر بھی تھا۔ وہ سڑک پار کر رہا تھا۔ کسی ڈر اور خوف کے بغیر۔ لگتا تھا کہ احساس ہی نہیں کہ ایک ٹانگ ضائع ہو چکی ہے۔ کیسے اور کیوں۔ یہ صرف وہی بتا سکتا تھا۔ بہرحال کچھ اُکتائے ہوئے بندر بھی تھے جو صرف سڑک پر ٹریفک کا بہاؤ اور انسانوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔

نتھیا گلی میں ریسٹ ہاؤس کافی بہتر تھی۔ وہاں، پرانا سرکاری سٹاف موجود تھا۔ ریسٹ ہاؤس، دراصل چیف سیکرٹری کا پرانا گھر تھا۔ سابقہ حکومت نے نتھیا گلی کے تمام ریسٹ ہاؤس عام آدمیوں کے رہنے کیلئے کھول دیے ہیں۔ تقریباً تین چار سال سے کوئی بھی شخص یہاں ٹھہر سکتا ہے۔ سٹاف بے حد ملنسار اور اچھا تھا۔ شوکت ویٹر تھا یا باورچی۔ بہرحال مستعدی سے مہمانوں کے کام

کر رہا تھا۔ باقی دو بندوں کا نام بھول چکا ہوں۔ کمرے کافی بہتر حالت میں تھے۔ مگر ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ انکی صورتحال کو مزید بہتر بنانے کی اَشد ضرورت ہے۔ صوبائی حکومت کی توجہ شائد ابھی اس طرف گئی نہیں ہے۔ حکومت کے ڈاک بنگلے اور ریسٹ ہاؤسز کو بہترین حالت میں رکھنا صرف اور صرف حکومت ہی کے فرائض میں شامل ہے۔ ان مقامات کو پیسہ کمانے کی مشین بنانا مناسب نہیں۔ علم میں آیا کہ سیاحوں سے تمام پیسے آن لائن، کسی صوبائی محکمے کے اکاؤنٹ میں چلے جاتے ہیں۔ مگر ریسٹ ہاؤسز کی حالت بہتر بنانے کیلئے وسائل مہیا نہیں کیے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ کے پی کی حکومت کو ان ڈاک بنگلوں سے آنے والے کرایوں کا کم از کم پندرہ سے بیس فیصد انہی کی بہتری پر خرچ کرنے چاہیے۔ کچھ کمروں کا فرنیچر آخری دموں پر تھا۔ باہر رکھی ہوئی کرسیاں خود بتا رہی تھیں کہ اب اپنی عمر پوری کر چکی ہیں، لہذا انہیں تبدیل کر کے نئی کرسیاں آنی چاہیے۔ پچاس فیصد فرنیچر بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اسے فوری طور پر تبدیل کر دینا چاہیے۔ دربارہ عرض کرونگا کہ یہ ڈاک بنگلے ایک صدی سے بھی پرانے ہیں۔ اگر انکی مناسب دیکھ بھال نہ کی گئی تو یہ ختم ہو جائینگے۔

رات کو کھانے کیلئے باہر نکلے تو ہر طرف سر ہی سر تھے۔ بچے، بچیاں، مرد، خواتین اور بزرگ اتنی زیادہ تعداد میں موجود تھے کہ لگتا تھا پورا پاکستان اس جگہ آ چکا ہے۔ آبادی کے سیلاب کی بدولت مقامی لوگ اپنا کاروبار خوب چمکا رہے تھے۔ اوسط درجے کے ہوٹل اور بالکل واجبی سے ریسٹورنٹ لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پہلے تو دل چاہا کہ واپس ریسٹ ہاؤس چلا جاؤں۔ کم از کم اتنے زیادہ بشر تو نہیں ہونگے۔ مگر پھر فیصلہ کیا کہ نہیں، ہم سارے یہیں پر کھانا کھائینگے۔ ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ ہال کے بالکل ساتھ ایک بالکونی تک میں بھی مہمان کھانا کھا رہے تھے۔ پلاسٹک کی کرسیاں اور بھاگ دوڑ کرنے والے دو ملازمین۔ ویسے جو معیار لاہور میں کھانے پینے کی اچھی جگہوں نے قائم کیا ہے، وہ صرف اسی شہر کا خاصہ ہے۔ کسی بھی دوسرے شہر یا قصبے میں ایسا بلند معیار نہیں مل سکتا۔ غلطی سے وہی معیار اس ریسٹورنٹ میں بھی تلاش کرتا رہا۔ ہوٹل کا مالک ایک کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا، انتہائی بوریت سے گاہکوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اسے اس جگہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے زبردستی یہاں بٹھایا گیا ہے۔ صفائی بس معمولی سی تھی۔ خیر کھانا بہت اچھا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ ایک دم، مکمل طور پر بھرا ہوا ہال خالی ہونے لگا۔ جیسے جیسے رات ہوتی ہے، نتھیا گلی میں چہل پہل کم ہوتی جاتی ہے۔ حالانکہ دنیا میں تفریحی مقامات کا اصل حسن، رات کو ہی باہر آتا ہے۔ مغربی ملک کے کسی اچھے مقام پر چلے جایئے۔ صاف ستھرے ہوٹلوں اور کیفوں کی قطاریں بنی ہوتی ہیں۔ اصل مزا تو باہر بیٹھنے کا ہی ہوتا ہے۔ نتھیا گلی تو بے حد خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں تو انتہائی جدید طرز کے ہوٹل، دکانیں اور کیفے ہونے چاہییں۔ چوڑی سڑکوں کے کناروں پر جگمگاتی ہوئی چھتریاں ہونی چاہییں۔ جہاں لوگ طویل عرصے کیلئے بیٹھ کر خوبصورت مناظر کو آنکھوں میں سموسکیں۔ مگر مجھے وہاں کسی قسم کی کوئی ترتیب نظر نہیں آئی۔ اچھے معیار کے ہوٹل بھی ناپید نظر آئے۔ ہوسکتا ہے کہ میں غلط ہوں۔ مگر اس تفریحی مقام میں ہرگز ہرگز بین الاقوامی سطح کی سہولیات میسر نہیں ہیں۔ یہ کون کریگا۔ کم از کم اسکا جواب مجھے نہیں مل سکا۔

واپسی پر ریسٹ ہاؤس پہنچنے کیلئے کافی چڑھائی کا سامنا تھا۔ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ایک جگہ دو تین منٹ کیلئے رُک کر دوبارہ چلنا پڑا۔ یہ تھکن بے حد عمدہ تھی۔ اگلے دن صبح کے وقت، کمرے کے باہر کرسیاں لگوائیں۔ کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ یہ بہترین

وقت تھا۔مکمل خاموشی۔حدِ نظر تک درخت ہی درخت تھے۔صبح کو ٹریفک بھی نہیں تھی۔شور بھی نہیں تھا۔لوگ بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ خاموشی کو پہاڑی کوؤں کی آواز کرختگی سے توڑتی تھی۔عجیب بات تھی کہ وہاں کوؤں کے علاوہ بہت کم پرندے دیکھنے کو ملے۔شائد جنگلوں میں مقیم ہوں۔دونوں ویٹر تھوڑی دیر کیلئے سامنے آ کر خود ہی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔معلوم ہوا کہ کے پی کی سابقہ حکومت نے تعلیم،صحت اور بنیادی سہولیات کے معاملے میں کافی ترقی کی ہے۔ہاں کچھ ناقابل یقین باتیں ان لوگوں نے بتائیں۔کہنے لگے کہ مقامی سرکاری ہسپتال میں پہلے کوئی ڈاکٹر نہیں ہوتا تھا۔اب رات دو بجے بھی جائیں تو ڈاکٹر موجود ہوتا ہے۔سکولوں کی حالت بھی بہت بہتر ہوئی ہے۔دور دراز، پہاڑوں کے درمیان سکولوں میں بھی استاد مقررہ وقت پر موجود ہوتے ہیں۔سرکاری سکول بے حد بہتر ہوئے ہیں۔بتایا کہ پٹواری اور پولیس والے دونوں فوری طور پر جائز کام کر دیتے ہیں۔کوئی رشوت یا پیسے مانگنے کی جرات نہیں کرتا۔اگر یہ بات سچ ہے تو سابقہ صوبائی حکومت واقعی احسن کام کر رہی تھی۔موقعہ نہیں ملا۔ورنہ سکول اور ہسپتال خود جا کر دیکھتا۔بہر حال سنی سنائی بات کر رہا ہوں۔ہاں پولیس کے متعلق ایک اور بات سننے کو ملی۔نتھیا گلی سے منسلک ایک گاؤں میں گاڑی چوری ہوگئی۔مالک مقامی تھانے میں گیا۔تھانیدار نے ایف آئی آر درج کرنے میں لیت ولعل کی۔ایف آئی آر درج نہ ہو پائی۔گاڑی کے مالک نے پشاور میں آئی جی کے دفتر میں شکایت والی ای میل کی۔چند گھنٹوں بعد،آئی جی کے حکم سے پرچہ بھی درج ہوا اور تھانیدار کو کاہلی اور سستی کی بدولت معطل کر دیا گیا۔یہ تمام باتیں سن کر خوشی ہوئی کہ چلو ایک صوبے نے تو حکومتی جبر کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔درختوں کی بے حد حفاظت کی جا رہی ہے۔کچھ لوگوں نے بتایا کہ اگر کوئی درخت کاٹنے کی کوشش کرے،تو ملزم کو فوری طور پر سزا ملتی ہے۔پچاس ہزار جرمانہ تو کم سے کم ہے۔اس سختی کی بدولت آج نتھیا گلی میں درخت پھل پھول رہے ہیں۔

آبادی کے حساب سے ہمارے پاس تفریحی مقامات بہت کم ہیں۔سیاحت کی بین الاقوامی سطح کی سہولیات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔نتھیا گلی جیسی جگہ کو بہتر اور جدید بنانا مشکل کام ضرور ہے مگر اتنا بھی مشکل نہیں۔صرف حکومتی عزم چاہیے۔جو میری دانست میں،موجود ضرور ہے۔مگر ابھی بھی بہت زیادہ طاقتور نہیں ہے۔واپسی پر وادی سے بادل باہر نکل کر سڑک تک پہنچ چکے تھے۔ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔وادی اور درخت بالکل غائب ہو چکے تھے۔ایک مقام پر تو دھند اتنی نیچے آ گئی کہ گاڑی اس میں گم سی گئی۔ایسے لگتا تھا کہ ہم بادلوں کے بالکل درمیان میں ہیں۔ویسے سارے مناظر،موسم اور کیفیات انسان کے اندر ہوتی ہیں۔پر مسئلہ یہ ہے کہ اندر کے بادل کبھی نظر نہیں آتے!

راؤ منظر حیات